Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ہم کو حق کس چیز کا تھا۔ پیٹ پالنے کا چارہ کر رہے تھے۔ میں تو کہتا ہوں کہ ہم ایک پودا لگانے یہاں آئے تھے، وہ لگا دیا ہے۔ نئی زمین پر قدم جمانے کے لیے کیا کچھ نہیں کرنا پڑتا۔ یہ زندگی کا اصول ہے۔ کوئی زمانہ آسان نہیں ہوتا۔ اب حالت بہت بہتر ہو چکی ہے مگر نئے آنے والے سے پوچھ کر دیکھو تو پتا چلتا ہے۔ سب زمانے سخت ہوتے ہیں۔ پھر بھی، آج کل کئی باتیں بہتر ہو گئی ہیں۔ نئے مکانوں کے نقشوں پر قانون لاگو ہو گئے ہیں۔ ہوا داری کا انتظام ہونا ضروری ہو گیا ہے۔ جگہ تھوڑی ہوتی ہے مگر دیواروں میں ہر طرف کھڑکیاں ہوتی ہیں۔ کھڑکیوں میں بڑے بڑے شیشے لگے ہوئے ہوتے ہیں۔ سارے گھر میں روشنی آتی رہتی ہے۔ ہمارے اُس مکان کے اندر اندھیرا ہی اندھیرا تھا۔ وکٹوریہ کے زمانے میں زمین کافی ہوتی تھی، مکان بڑے بڑے ہوا کرتے تھے، مگر کھڑکیاں تنگ تنگ ہوتی تھیں، جیسے گرجوں میں ہوتی ہیں۔ لمبے لمبے غار نما مکان ہوتے تھے جن میں کئی بڑے اور چھوٹے کمرے ہوتے تھے۔ ہمارے مکان میں دس کمرے تھے، کمرے اصل میں نو ہی تھے۔ دسواں ایک چھوٹا سا کابک نما کمرہ چھت میں تھا جو اٹک کہلاتا تھا۔ اُس گھر کا ایک تہہ خانہ بھی تھا جسے انگریزی میں سیلا کہتے تھے۔ یہ واقعی سیلا تھا، یعنی اس کے اندر ایک ایک فٹ پانی کھڑا رہتا تھا۔

پہلی منزل پر تین کمرے تھے جن میں چھ میر پوری رہتے تھے۔ اس کے علاوہ باورچی خانہ اور باتھ تھے۔ دوسری منزل پر چار کمرے تھے۔ ان میں چھ حافظ آباد کے ایک گاؤں کے آدمی اور دو بنگالی رہتے تھے۔ تیسری منزل پر دو کمرے تھے۔ یہ دونوں چھوٹے چھوٹے کمرے تھے۔ ایک میں میں اور غلام محمد رہتے تھے اور دوسرے میں حسین شاہ اکیلا رہتا تھا۔ آخری آدمی ثاقب تھا جو چھت کے اندر اپنی کبوتر کی کابک میں رہتا تھا۔ ہمارے دروازے کے باہر لکڑی کی ایک سیڑھی کھڑی رہتی تھی۔ ثاقب یہ سیڑھی لگا کر اُوپر چڑھتا تھا اور چھت میں سے ایک چوکور پھٹا ہٹا کر اٹک تک پہنچتا تھا۔ یہ پھٹا اٹک کا دروازہ

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

تھا۔ پھر وہ ہاتھ اندر جماتا اور اُدر اچک کر اٹک میں داخل ہو جاتا۔ وہاں وہ ٹانگیں لٹکا کر بیٹھ جاتا تھا۔ وہیں بیٹھے بیٹھے جھک کر وہ بوٹ اتارتا اور پھر پاؤں اندر کھینچ لیتا۔ اندر کھڑے ہونے یا مڑنے کی جگہ نہ تھی، صرف اتنی جگہ تھی کہ بستر کا گدا فرش پر آجائے۔ ثاقب بیٹھا بیٹھا اپنے آپ کو گھسیٹ کر گدے پر لیٹ جاتا تھا۔ اندر ایک بلب لگا تھا جو بجلی کی تار کے ذریعے کیل کے ساتھ بندھا ہوا تھا۔ دیوار پر لکڑی کے چھوٹے چھوٹے خانے بنے ہوئے تھے جن میں ثاقب کی چیزیں پڑی رہتی تھیں۔ اُس کے دو تین کپڑے تھے جو تہہ کر کے تکیے کے نیچے رکھے ہوئے تھے۔ چھت میں ایک طرف چھوٹی سی ترچھی کھڑکی تھی جس میں اندھا شیشہ لگا ہوا تھا۔ کبھی کبھی ثاقب دن بھر کی مزدوری کرنے اور پھر اُچک کر چھت میں چڑھنے کی محنت سے تھک کر ہار جاتا اور اس میں اتنی ہمت نہ رہتی کہ ہاتھ لمبا کر کے بوٹوں کے تسمے کھولے۔ ایسے موقعوں پر وہ کئی کئی منٹ تک اُسی طرح ٹانگیں لٹکائے بیٹھا رہتا۔ کبھی کبھی وہ بلب جلا کر اپنے رسالوں کے خانے سے ایک رسالہ اُٹھا لیتا اور اسے پڑھنے لگتا۔ ہم لوگ کبھی کبھی فلمی رسالوں کی ورق گردانی کیا کرتے تھے۔ ثاقب نے کبھی فلمی رسالے کو دیکھا بھی نہ تھا۔ اُس کے پاس اُردو کے ادبی رسالے ہوتے تھے۔ جب وہ کوئی رسالہ اٹھا لیتا تو ایک ایک گھنٹے تک پڑھتا رہتا اور اُسے بوٹ اتارنے کی ہوش نہ رہتی۔ اُس وقت عجیب منظر ہوتا۔ چھت کی موری سے دو ٹانگیں لٹک رہی ہوتیں اور لٹکتی رہتیں، جیسے کوئی مرا ہوا ہو۔ غلام محمد کا دل گھبرانے لگتا۔ جب کافی دیر گزر جاتی تو غلام محمد کی برداشت ختم ہو جاتی۔ وہ بار بار دروازے سے سر نکال کر دیکھتا اور کہتا، "اوئے ثاقبا، تیرے پیر سوج جائیں گے۔ بوٹ اُتار دے۔" ثاقب اپنے اٹک میں خوش تھا۔ اُسے صرف پچاس شلنگ کرایہ دینا پڑتا تھا۔ ایک سال کے بعد جب ہمارے کرایے ڈبل ہو گئے تو اُس کا صرف پندرہ شلنگ ہوا۔ یہودیوں نے ان مکانوں کی مرمت کرانی چھوڑ دی ہوئی تھی۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ان کو پتا تھا کہ اس سارے محلّے کی حالت خستہ ہو رہی ہے۔ کبھی کبھی حکومت ان کی قیمت ادا کر کے انہیں گرا دے گی، چنانچہ اُوپر پیسا صرف کرنے کا کوئی فائدہ نہیں۔ آہستہ آہستہ سب بڑے مکان مسماری کے پروگرام میں آ گئے۔ مگر ان پروگراموں کو پورا ہوتے ہوئے وقت لگتا ہے۔ مالکوں کی پالیسی یہ تھی کہ جب تک کھڑے ہوئے ہیں ان سے پیسے پیدا کر لو۔ اُسی زمانے میں سمگلنگ کا کاروبار شروع ہو گیا۔ مالک مکانوں کے مزے ہو گئے۔ ہمارے جیسے غیر قانونیوں کو سر چھپانے کے لیے جگہ چاہیے تھی، منہ مانگے پیسے دینے کے لیے تیار تھے۔ ان مالکوں نے ڈبل کرایہ لگا کر ہمارے لوگوں کو مکانوں میں بھر لیا۔ کسی نے ذرا چوں کی تو اُس کی خفیہ رپورٹ کر دی، وہ بے چارہ کام پر ہی پکڑ لیا گیا۔ افسوس کی بات ہے مگر سچی ہے کہ ان مالک مکانوں میں بہت سے ہمارے لوگ بھی تھے۔ انہوں نے بھی یہی دھندا کیا۔ مگر میں ان کو برا نہیں کہتا۔ وہ تو ہماری طرح بے وطن تھے اور پیر جمانے کے لیے یہ کسب کر رہے تھے۔ یہودیوں کو کس بات کی کمی تھی؟ ہوتے ہوتے ہمارے محلّے کا نقشہ ہی بدل گیا۔ رنڈیوں کو جب پتا چلا کہ اس علاقے میں ان کی مانگ ہے تو سب کی سب اُٹھ کر ادھر آ گئیں۔ مالک مکانوں کے لیے وہ بھی ہماری طرح نفع بخش تھیں، غیر قانونی دھندا کرتی تھیں اس لیے منہ مانگے پیسے دینے کے لیے تیار تھیں۔ انہیں دُور نہیں جانا پڑتا تھا، اس علاقے میں ان کے بنے بنائے گاہک موجود تھے۔ جب میں یہاں پہنچا تو اُس وقت اس علاقے میں دو طرح کے لوگوں کی آبادی تھی۔ غیر قانونیوں کی اور رنڈیوں کی۔ باقی کیفوں اور پبوں والے تھے۔ ہم لوگ ایک دوسرے سے مل جُل کر رہتے تھے۔ کہیں کہیں دو چار سٹوڈنٹ ایک کمرہ کرایے پر لے کر رہا کرتے تھے۔ مالک مکانوں کو ہر طرف سے ڈبل فائدہ تھا۔ ہمارا کرایہ ایک سال کے اندر تین پونڈ سے چھ پونڈ ہو گیا۔ مگر ہماری بہتری اسی میں تھی کہ چُپ چاپ ادا کر دیں۔ ہمارا اور کوئی خرچہ نہ تھا، صرف روٹی پانی اور بس کے کرایے کا خرچہ تھا۔ باقی سارا پیسا

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

پیچھے جاتا تھا یا جمع ہوتا تھا۔

ایک سال تک ہماری زندگی اُسی مکان کے اندر گزری۔ مکان کی تین منزلیں تھیں اور ایک اٹک۔ مگر آبادی کے حساب سے مکان دو حصّوں میں بٹا ہوا تھا یہ بٹائی باورچی خانے کی وجہ سے ہوئی تھی۔ پہلی دو منزلوں کا باورچی خانہ نیچے تھا جس میں باقاعدہ الماریاں اور خانے تھے اور میز اور دو کرسیاں بچھی ہوئی تھیں۔ ہماری منزل کا باورچی خانہ ہماری سیڑھیوں کے اوپر تھا۔ باورچی خانہ کیا تھا، چھوٹے سے گزرنے والے رستے میں مالک نے گیس کا چولہا رکھ دیا ہوا تھا۔ پاس ایک چھوٹی سی میز تھی اور دیوار کے ساتھ پانی کی ٹونٹی اور بیسن لگا ہوا تھا۔ بس، غلام محمد، حسین شاہ اور ثاقب یہیں پر کھاتے پکاتے تھے۔ ثاقب نے کبھی کھانا نہیں پکایا تھا۔ اس کو کھانا پکانا آتا ہی نہ تھا۔ وہ ہفتے کے دن سات دن کے کھانے کی چیزیں خرید کر لے آتا اور حسین شاہ کو دے دیتا۔ حسین شاہ اُس کا روٹی سالن پکاتا تھا۔ حسین شاہ چٹا ان پڑھ تھا۔ ثاقب بدلے میں اُس کی ساری خط و کتابت کرتا، اُس کی خریداری کر کے لاتا، اور کبھی کبھی اُس کے کپڑے بھی دھو دیا کرتا تھا۔ مگر حسین شاہ اس کے علاوہ بھی ثاقب سے فائدہ اٹھاتا تھا۔ یعنی وہ ثاقب کو ہفتے کا کھانا پکانے کی چیزیں لکھوا دیتا اور ثاقب خرید کر لے آتا، مگر حسین شاہ ثاقب کے حصّے میں سے آدھا خود کھا جاتا اور آدھا ثاقب کو پکا کر دیتا۔ حسین شاہ کیمبل پور کے گاؤں کا رہنے والا پٹھان تھا۔ وہ چھوٹے سے قد اور خوب گٹھے ہوئے جسم والا مضبوط آدمی تھا۔ اُس کے چہرے پر بڑی بڑی مونچھیں تھیں اور اس کے اگلے دو دانت ٹوٹے ہوئے تھے، جس سے اُس کا چہرہ مزاحیہ شکل کا ہو گیا تھا۔ مگر حسین شاہ کے اندر ایک قدرتی رعب داب تھا۔ اُس نے کبھی کسی کے ساتھ سختی نہ کی تھی، مگر ہر وقت ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ابھی اُٹھ کر مار پٹائی شروع کر دے گا۔ اس وجہ سے حسین شاہ جو بات بھی کہتا وہ چوں چرا کے بغیر مان لی جاتی تھی۔ ثاقب کے ساتھ حسین شاہ بہت نرمی اور پیار سے پیش آتا تھا۔ اُس نے کئی بار ثاقب

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

کو اپنے کمرے میں مفت رہائش کی پیش کش کی تھی۔ مگر ثاقب اپنے اٹک میں خوش تھا۔

میرے کمرے کا ساتھی غلام محمد تھا۔ غلام محمد گجرات کے ایک گاؤں کا رہنے والا تھا اور پہلے فوج میں حوالدار رہتا تھا۔ وہ مجھ سے چھ مہینے پہلے اِدھر آیا تھا۔ جب میں یہاں پہنچا تو غلام محمد کی زندگی سیٹ ہو چکی تھی۔ مجھے اس بات کا اسی دن کو پتا چل گیا جب میں پہلی دفعہ اس کمرے میں داخل ہوا۔ کئی برس گزر گئے ہیں مگر آج بھی وہ منظر میری آنکھوں کے سامنے ہے۔ شام کا وقت تھا۔ اس ملک میں سردیوں کے موسم میں چار بجے ہی رات پڑ جاتی ہے۔ ہر وقت اندھیرا چھایا رہتا ہے۔ اُوپر سے میں اس مکان میں آپہنچا جو پہلے ہی سُرنگ کی طرح اندھیرا تھا۔ ہمارے کمرے میں اُس وقت غلام محمد اکیلا رہتا تھا۔ جب میں اُس کمرے میں داخل ہوا تو اندر کچھ بھی دکھائی نہ دیا۔ میں نے ہاتھ سے ٹٹول کر بجلی کا بٹن دبایا تو کچھ بھی نہ ہوا، کمرے میں اُسی طرح اندھیرا چھایا رہا۔ میں ٹٹول کر فرش پر پڑے ہوئے گدے پر بیٹھ گیا۔ سیڑھیوں پر بھی اندھیرا تھا۔ جو آدمی مجھے چھوڑنے آیا تھا وہ آدھی سیڑھیوں میں ہی چھوڑ کر چلا گیا تھا۔ جب سیڑھیاں ختم ہوئیں تو اندھیرے میں مجھے گیس کے چولہے کا ٹھڈا لگا تھا، جس سے میری ٹانگ کی نالی ابھی تک درد کر رہی تھی۔ وہ پہلا دن مجھے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے یاد رہے گا۔ میں اندھیرے کمرے میں دو تین گھنٹے تک دیوار کے ساتھ بیٹھا رہا۔ حسین شاہ کے کمرے میں بتی جل رہی تھی مگر دروازہ بند تھا۔ پھر اُس نے بتی بجھائی اور دروازہ کھول کر کام پر چلا گیا۔ کمرے میں اب صرف کھڑکی کے راستے گلی کی تھوڑی تھوڑی روشنی آ رہی تھی۔ جب میری آنکھیں اندھیرے سے واقف ہوئیں تو میں نے دیکھا کہ کمرے میں بلب لٹک رہا تھا شاید جل چکا تھا۔ پھر بھی میں نے ہاتھ اُٹھا کر دو تین بار بجلی کا بٹن دبایا۔ جس گدے پر میں بیٹھا اُس پر کئی کمبلوں اور چادروں کا اونچا نیچا بستر بچھا ہوا تھا۔ پاس ایک لکڑی کی میز تھی

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

جس کے اُوپر کچھ برتن پڑے تھے۔ ٹھیک طرح سے دکھائی نہیں دیتا تھا کہ کس قسم کے برتن ہیں، مگر یہ پتا چلتا تھا کہ برتن ہیں۔ اس کے علاوہ کمرے میں اور کچھ نہیں تھا۔ میرا پیٹ خالی تھا اور مجھے کانپا لگ گیا۔ تھوڑی دیر کے بعد ایک آدمی سیڑھیاں چڑھا اور ایک گدّا اور دو تین کمبل دروازے کے باہر رکھ کر واپس چلا گیا۔ میں نے اُٹھ کر ایک کمبل لیا اور اسے لپیٹ کر پھر گدّے پر بیٹھ گیا۔ کوئی مجھ سے پوچھے کہ بے وطنی کی کیفیت کیا ہوتی ہے تو مجھے صرف وہ وقت یاد آتا ہے۔ اُس وقت تک میں سفر کرتا رہا تھا، میری کوئی جگہ نہ تھی۔ پھر اُس شام کو مجھے ایک چھت کا سایہ میسّر آگیا۔ میں نے اطمینان کا سانس لیا۔ مگر اطمینان کیسا۔ میرا پیٹ خالی تھا اور میرا سارا بدن اختیار سے باہر ہو کر کانپ رہا تھا۔ آج بھی کوئی مجھ سے پوچھے کہ بے وطنی کی حالت کیا ہوتی ہے تو مجھے اُس وقت کا خیال آتا ہے جب میں اپنے گھر میں بیٹھا تھا اور میرا دل خوف سے سُکڑ رہا تھا۔ یہ عجیب بات ہے۔ اب ہسپتال میں بھی مجھے اسی بات کا خیال آتا ہے۔ کئی برس گزر گئے ہیں اور اس بات کو یاد کرنے کا موقع ہی نہیں ملا۔ مگر اب دماغ کو ذرا مہلت ملی ہے تو وہ وقت آنکھوں کے سامنے آگیا ہے، جیسے وہیں پر رُکا ہوا ہو۔ میں سوچتا ہوں گزرا ہوا وقت کبھی ختم بھی ہوتا ہے یا ہمارے اندر ہمیشہ کے لیے کھڑا رہتا ہے؟ میرا پیٹ خالی تھا، یہ مجھے یاد ہے۔ سارا دن بھاگ دوڑ میں کچھ کھا پی نہ سکا تھا۔ جب یہاں پہنچا تو کسی نے مجھ سے بات نہ کی اور نہ کھانے کو پوچھا۔ بس اندھیرے کمرے میں چھوڑ دیا۔ ہوتے ہوتے سب لوگ اپنے کام پر چلے گئے یا کام سے واپس آکر سو گئے۔ میرے اُوپر کمزوری نے غلبہ پالیا اور میں اُونگھنے لگا۔ ساڑھے آٹھ بجے غلام محمد کام سے واپس آیا۔ میں اس کے پیروں کی آواز سُن کر جاگ پڑا۔ مجھے اٹھتا دیکھ کر غلام محمد تھوڑی دیر تک مجھے دیکھتا رہا، مگر مُنہ سے کچھ نہ بولا اور میرے پاس سے گزر کر میز کی طرف چلا گیا۔ اُس نے موٹا کوٹ اور سر پر انجن ڈرائیوروں والی ٹوپی پہن رکھی تھی

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

جو کانوں کو بھی ڈھک کر رکھتی ہے۔ پاؤں میں اُس نے فوجی فُل بوٹ چڑھاتے ہوئے تھے اور اپنی پتلون بُوٹوں کے اندر کس رکھی تھی۔ میری آنکھیں اب اندھیرے میں اچھی طرح دیکھ سکتی تھیں۔ مگر غلام محمد ابھی باہر سے آیا تھا اور آسانی سے چل پھر رہا تھا، جیسے اُس کی نظر کو کوئی فرق نہ پڑتا ہو۔ اُس نے اوورکوٹ کی ایک جیب سے ڈبل روٹی اور دوسری سے پکے پکائے لوبیے کا ڈبّہ نکالا اور دونوں چیزوں کو میز پر رکھ دیا۔ پھر اُس نے چاقو اٹھا کر لوبیے کا ڈبّہ کھولا اور اسے فرائی پان میں اُلٹ دیا۔ فرائی پان کو اُٹھا کر وہ باہر لے گیا اور اندھیرے میں گیس جلا کر اسے آگ پر رکھ دیا۔ جب لوبیا تڑ تڑ کرنے لگا تو غلام محمد اُسے اندر لے آیا اور گدّے پر بیٹھ کر ڈبل روٹی اور مکھن کے ساتھ جھپ جھپ کھانے لگا۔ کھاتے کھاتے وہ ڈبل روٹی پر مکھن اس طرح لگا رہا تھا جیسے اینٹوں پر گارا تھوپ رہا ہو۔ پھر وہ ہاتھ روک کر پہلی بار منہ سے بولا:

"آج آئے ہو؟"

میں نے کہا: "ہاں۔"

"کچھ کھایا پیا؟"

میرا پیٹ خالی تھا مگر میں نے کہا: "جی بسم اللہ کرو۔"

غلام محمد نے دو تین منٹ میں فرائی پان پونچھ کر صاف کر دیا۔ پھر وہ برتن کو ایک طرف فرش پر رکھ کر اُٹھ کھڑا ہوا۔ اس نے پہلے ٹوپی اور پھر اوورکوٹ اُتارا اور اُنہیں دروازے کے پیچھے کیل سے ٹانگ دیا۔ پھر آ کر گدّے پر بیٹھ گیا اور بوٹ اُتارنے لگا۔ میں اُس کے گدّے سے اُٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ بوٹ اُتارتے اُتارتے غلام محمد نے کہنی سے باہر کی طرف اشارہ کیا۔ "گدّا لے آؤ۔" وہ بولا۔ بس، یہ اُس نے آخری بات کی۔ میں گدا اور کمبل اُٹھا کر اندر لے آیا۔ گدّے کو میں نے دوسری طرف فرش پر ڈال دیا۔ اوپر کمبل رکھ دیے۔ اتنی دیر میں غلام محمد بوٹ اُتار چکا تھا۔ اُس نے بوٹ جوڑ کر گدّے کے پاؤں کی طرف

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

رکھ دیے۔ پھر اُس نے بستر پر بیٹھ کر پتلون اُتاری اور اُسے پھیلا کر بُوٹوں کے اُوپر رکھ دیا۔ نیچے اُس نے پاجامہ پہنا ہوا تھا۔ پاجامہ موٹی موٹی جُرابوں کے اندر گھسا تھا۔ غلام محمد نے نہ جُرابیں اُتاریں اور نہ سویٹر، صرف قمیض کی کالر والا بٹن کھولا اور کمبل اوڑھ کر سو گیا۔ دو چار منٹ کے اندر وہ خراٹے لینے لگا۔ میں اپنے گدّے کے پاس کھڑا تھا۔ تھوڑی دیر کے بعد میں کمبل اوڑھ کر گدے پر بیٹھ گیا۔ میری بھوک کچھ دب گئی تھی۔ مگر میرے دل میں ایک خوف تھا جو کسی طرح کم نہ ہوتا تھا۔ میری اتنی ہمّت نہ ہوتی تھی کہ گدّے پر لیٹ کر سو جاؤں۔ وہ پہلی رات بڑی سخت تھی۔ صبح سویرے غلام محمد کی گھڑی نے الارم بجایا تو وہ اُچھل کر اُٹھ کھڑا ہوا۔ اُس نے کمبل اُتار کر ایک طرف پھینکے۔ پتلون غلام محمد کے پاؤں کے پاس پھیلی ہوئی تھی۔ بستر پر بیٹھے بیٹھے گھسٹ کر اُس نے ٹانگیں سیدھی پتلون میں ڈال دیں۔ پیر دوسری طرف سے نکال کر اُس نے فُل بوٹ چڑھائے اور پتلون کو اُن کے اندر کس لیا۔ پھر وہ اُٹھ کھڑا ہوا۔ کھڑے ہو کر اُس نے پتلون باندھی، کالر کا بٹن بند کیا، اوور کوٹ پہنا اور سر پر ٹوپی جمائی۔ دروازے کے پیچھے ایک چھوٹا سا شیشہ لٹکا ہوا تھا۔ غلام محمد نے اُس شیشے میں اپنا مُنہ دیکھا، مونچھوں پر ہاتھ پھیر کر انہیں درست کیا اور ٹوپی کو اٹھا کر دوبارہ سر پر جمایا۔ غلام محمد کی آنکھیں اندھیرے سے خوب واقف تھیں۔ اس کے بعد وہ دروازہ کھول کر باہر نکل گیا۔ گھڑی کی سوئی چمک رہی تھی۔ غلام محمد دو منٹ کے اندر اندر گھر سے نکل گیا۔ میں اس کی چُستی پر حیران رہ گیا۔ جتنی دیر میں اور غلام محمد ساتھ ساتھ رہے غلام محمد کا یہی دستور رہا۔ اس کی زندگی سیٹ ہو چکی تھی۔ وہ صبح ساڑھے سات بجے گھر سے نکل جاتا اور شام کو ساڑھے آٹھ بجے واپس آتا۔ ہفتے کے سات دن کام کرتا۔ رفع حاجت اور ناشتہ وہ فیکٹری میں جا کر کرتا۔ وہ تین پونڈ کرایہ دیتا تھا اور باقی کل تین پونڈ میں خرچہ پورا کرتا تھا۔ ایک سال کے اندر اندر اُس نے مجھے بتایا کہ پیچھے گاؤں میں اُس نے دس کِلے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

زمین خرید لی ہے۔ میں اُسے دیکھ دیکھ کر حیران ہوتا تھا کہ یہ آدمی سارا دن فیکٹری میں اور ساری رات اندھیرے میں گزارتا ہے۔ مگر بعد میں معلوم ہوا کہ اس گھر کے زیادہ تر لوگوں کا یہی دستور تھا۔ کچھ دنوں کے بعد میرا بھی یہی طریقہ بن گیا۔ اسی میں ہماری بہتری تھی۔ منہ اندھیرے کام پہ گئے اور اندھیرا پڑے واپس آئے نہ زیادہ منہ ادھر ادھر دکھایا، نہ کوئی خطرہ مول لیا۔ جب میرا کام لگ گیا تو پہلے ہفتے کی تنخواہ سے میں دو بجلی کے بلب بھی خرید کر لایا، جو میں نے اپنے کمرے میں اور سیڑھیوں پر لگا دیے۔ اس طرح کمرے کی کالی رات سے چھٹکارا حاصل ہوا۔ ثاقب میرے آنے کے تین مہینے کے بعد آیا اور اٹک میں قائم مقام ہوا۔ ثاقب ہم لوگوں سے مختلف تھا۔ میں نے انٹرنس کی کلاسوں تک تعلیم پائی ہے۔ مگر ثاقب نے کالج میں بھی ایک دو سال لگا رکھے تھے۔ اس کے علاوہ وہ نوعمر لڑکا تھا اور مزاج کا نازک تھا۔ پیچھے اس کا بال بچا کوئی نہ تھا، صرف ایک ماں تھی جس کو ثاقب ہفتے میں ایک خط لکھتا اور مہینے کے بعد کچھ پیسے بھیج دیتا تھا۔ اس وجہ سے وہ صرف آٹھ گھنٹے کام کرتا، کبھی کبھار فورمین اسے مجبور کرتا تو وہ اوور ٹائم لگا لیتا تھا، ورنہ باقی کا وقت اٹک میں یا ہمارے کمروں میں بیٹھا پڑھتا رہتا تھا۔ دوسرے سب لوگ دیہات کے رہنے والے تھے، صرف ثاقب شہری تھا اور پڑھا لکھا تھا، اس لیے جب کسی کو ضرورت پڑتی ثاقب اس کی انگریزی خط و کتابت کیا کرتا تھا۔ نیچے کی منزل والوں کی ایک بنگالی کرتا تھا۔ مگر ان لوگوں سے ہمارا واسطہ بہت کم پڑتا تھا۔ کچھ ہفتوں کے بعد ایک دو بار میں نے غلام محمد کو کھانا پکا کر دیا تو اُس کو بھی پکا ہوا کھانا کھانے کی عادت پڑ گئی۔ اس طرح سے اُوپر کی منزل پر ہم چاروں کا ایک کنبہ بن گیا۔

نیچے والوں سے ہمارا میل ملاپ لین دین زیادہ نہیں ہوتا تھا۔ آتے جاتے ہوتے سلام علیک ہو جاتی تھی۔ ٹائلٹ ہماری منزل پر اپنا تھا۔ ویسے بھی رفع حاجت

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

کا وقت گھر میں کہاں ملتا تھا، زیادہ تر فیکٹریوں میں جا کر ہوتی تھی۔ ہمارا ٹائمٹ سب سے زیادہ حسین شاہ استعمال کرتا تھا۔ حسین شاہ راتوں کو ڈیوٹی دیتا تھا اور صبح سویرے گھر آنے کے بعد نماز ادا کیا کرتا تھا۔ وہ کہتا تھا کہ رات کی ڈیوٹی اس کے لیے خرب سیٹ ہے کیونکہ گھر میں وہ دن بھر نماز کا فرض ادا کر سکتا ہے۔ باقی صرف باتھ کے لیے نیچے جانا پڑتا تھا، وہ بھی اتوار کے اتوار، اور سردیوں کے موسم میں ہر دوسری اتوار۔ پہلی منزل والے میرپوری اپنے تین کمروں میں رہتے تھے اور آپس میں ہی میل ملاپ رکھتے تھے۔ دوسری منزل والے حافظ آبادیوں کا بھی یہی حال تھا۔ صرف دو بنگالی ٹوٹنوں ان کے بیچ میں پھنسے ہوئے تھے جو ہر وقت بنگالی بولتے رہتے تھے۔ مگر حافظ آبادی بنگالیوں سے خوب فائدہ اٹھاتے تھے۔ ایک بنگالی کھانا پکانے کا ماہر تھا۔ وہ سارے حافظ آبادیوں کا کھانا پکایا کرتا تھا۔ دوسرا اپنی زبان کے علاوہ اردو اور انگریزی پڑھنا لکھنا جانتا تھا۔ وہ سب کی خط و کتابت کرتا اور خریداری کر کے لاتا تھا۔ ہفتے بھر کی خریداری کرنا سب سے مشکل کام تھا۔ خریداری کا مطلب تھا کہ دن کے وقت باہر جا کر دکانوں پر گھومتے پھرو اور پھر بڑے بڑے تھیلے ہاتھوں میں لٹکا کر گھر لاؤ۔ رستے میں ہر ایک کی نظر پڑتی تھی۔ ان دنوں میں یہ کام خطرے سے خالی نہ تھا۔ فیکٹریوں میں ہم لوگ آزاد پھرتے تھے حالانکہ وہاں پر ہر قسم کے لوگ موجود ہوتے تھے۔ مگر وہاں پر گورے ہم سے کام لیتے تھے، وہ ہماری حفاظت کے ذمہ دار تھے۔ ہمیں پتا تھا کہ وہ کبھی ہمیں ہاتھ سے جانے نہ دیں گے۔ ہم لوگ سب گندا مندا اور سخت کام کرتے تھے اور بارہ بارہ گھنٹے حاضری دیتے تھے۔ اُس زمانے میں اس ملک کے اندر خوش حالی تھی۔ فیکٹریاں خوب چلتی تھیں اور لیبر کی کمی تھی۔ ان کی اپنی لیبر تنخواہوں میں اضافے سے کرانتی بگڑ گئی تھی کہ گندے مندے اور سخت کاموں پر راضی نہ ہوتی تھی۔ صفائی کا کام، لدان کا کام، برفوں کے موسم میں باہر کا کام، ایسے کاموں پر یہ لوگ ہمیں لگاتے تھے۔ ہم لوگ نہ ناغہ کرتے تھے نہ چھٹی لیتے تھے، جو کوئی گورا غیر حاضر ہو جاتا تھا اس کی جگہ اوور ٹائم کرنے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

کے لیے ہر وقت تیار رہتے تھے، اور اُوپر سے تنخواہوں میں اضافہ نہ مانگتے تھے۔ مالکوں کو ہماری اصل حالت کا علم تھا، یہ بھی کہ ہم جعلی کارڈوں پر کام کر رہے تھے۔ مگر مالک ہم سے فائدہ اٹھاتے تھے اس لیے درگزر سے کام لیتے تھے۔ کئی مالک ہماری انشورنس کے پیسے بھی حکومت کو ادا نہ کرتے تھے بلکہ اپنی جیب میں ڈال لیتے تھے۔ افواہیں تھیں کہ ہم لوگ دراصل فیکٹری کے ریکارڈ پر ہی نہ تھے۔ دوسرے لفظوں میں ہم وہاں پر موجود ہی نہیں تھے۔ مگر اس وجہ سے ہم فیکٹریوں میں آزادی محسوس کرتے تھے۔ اس جعل سازی کے مرکز میں ہماری سب سے بڑی حفاظت کا سامان موجود تھا۔ گھر سے بھی زیادہ جب ہم کام پر ہوتے تو بے خطر ہوتے تھے۔ مگر ہفتے بھر کی خریداری کے لیے باہر جانا الگ بات تھی۔ یہ خطرناک کام تھا۔ ہزاروں ناواقف لوگ اِدھر اُدھر پھر رہے ہوتے۔ خبریں آتی تھیں کہ ہمارے لوگ جب پکڑے جاتے تو عام طور پر دکانوں کے اندر خریداری کر رہے ہوتے تھے۔ جب کوئی سودے کے لیے باہر جاتا تو اوورکوٹ اور گرم ٹوپی پہن لیتا اور دکانیں بند ہونے کے وقت پر جاتا جب بہت سے لوگ گھر جا چکے ہوتے۔ ہر ایک کی یہی کوشش ہوتی تھی کہ کوئی دوسرا ہی سودا سلف خریدنے کے لیے باہر جائے۔ پہلی اور دوسری منزل والوں کو تو بنگالی ہاتھ آگئے تھے۔ بنگالی اتنے بھولے نہ تھے، مگر میرپوری اور حافظ آبادی بارہ تھے اور بنگالی صرف دو۔ اس لیے ایک بنگالی نے حافظ آبادیوں کا کھانا پکانے اور دوسرے نے دونوں منزلوں کی خریداری کرنے کا ذمہ لے لیا تھا۔ بدلے میں میرپوری اور حافظ آبادی انہیں آرام سے رہنے دیتے تھے۔ ہماری منزل پر پہلے میں اور حسین شاہ باری باری باہر جایا کرتے تھے۔ پھر ثاقب ہم میں شریک ہو گیا تو وہ بھی خوشی خوشی جانے لگا۔ نوعمر لڑکا تھا اس لیے اسے ہماری طرح ڈر خوف نہ تھا۔ روز کے کام اور ہفتے کی خریداری کے علاوہ ہمارا سارا وقت گھر میں ہی گزرتا تھا۔

کام پر جانے کی تیاری میں اور واپس آکر کھانا پکانے میں سارا وقت لگ

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

جاتا تھا۔ اس کے بعد نیند پوری کرنی ہوتی تھی۔ گپیں مارنے کی مہلت کم ہی ملتی۔ کبھی کبھار مجھے اوور ٹائم نہ ملتا تو میں جلدی گھر واپس آجاتا۔ اس دن میں دو تین وقت کا سالن اکٹھا پکا لیا کرتا۔ پھر ثاقب اور میں بیٹھ کر اِدھر اُدھر کی باتیں کرتے یا تاش کی بازی لگا لیتے۔ صرف اتوار کا ایک دن ایسا ہوتا جب گھر میں سب کی ایک دوسرے سے ملاقات ہوتی۔ اٹھارہ میں سے پانچ آدمی ساتوں دن کام کرتے تھے۔ باقی اتوار کو گھر پر ہی ہوتے تھے۔ سارا دن میلے کا سماں ہوتا۔ خط پتر لکھنے لکھانے، ایک دوسرے کے قرض چکانے، مرچ مسالہ مانگنے اور کپڑے دھونے دھلانے میں اُوپر نیچے آتے جاتے رہتے۔ مگر دن میں کم از کم دو موقعے ایسے ہوتے تھے جن میں سب ایک ساتھ حصہ لیتے۔ پہلے فلم شو پر جانا ہوتا۔ ہمارے علاقے میں سکھوں نے ایک سنما کرایے پر لے کر اتوار کو دیسی فلمیں چلانی شروع کر دی تھیں۔ بعد میں انہوں نے سنما خرید لیا اور ساتوں دن اپنی فلمیں چلانے لگے۔ مگر پہلے پہل صرف اتوار کے دن دو فلموں کے چار شو ہوتے تھے۔ ہمارے لوگوں کی ساری آبادی وہاں پر موجود ہوتی تھی۔ کام والے کام اور بیمار اپنے بستر اور نمازی نماز چھوڑ کر اُدھر پہنچے ہوتے۔ کئی سو لوگوں کا مجمع ہوتا۔ آج کل تو ہر قسم کی آزادی ہو گئی ہے۔ جس فلم شو میں دل کیا جا کر گھس گئے۔ انگریزی، جرمنی، امریکی۔ ایسی ایسی فلمیں کہ دیکھ کر ہوش خراب ہو جائیں۔ مگر ان دنوں میں اتوار کا یہ فلم شو سارے ہفتے کا سنٹر ہوتا تھا۔ ہم لوگ سات دن اس شو کا انتظار کرتے رہتے تھے۔ دوپہر کے کھانے سے فارغ ہو کر ہم سب کے سب کپڑے بدلتے اور نیچے میر پوریوں کے کمرے میں جمع ہو جاتے۔ شو چار بجے شروع ہوتا تھا اور تین بجے ہمارا گھر سے چلنے کا وقت مقرر تھا۔ پندرہ منٹ پہلے ہی ہم دیر کرنے والوں کو نیچے سے آوازے لگانے شروع کر دیتے۔ دو دو چار چار کر کے جانے کا سوال ہی پیدا نہ ہوتا تھا۔ شو کے لیے ہم سب اکٹھے چلتے۔ اسی میں اپنی حفاظت تھی۔ آخر پورے تین بجے ہم تیرہ کے تیرہ صاف ستھرا

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

لباس اور چمکتے ہوئے بوٹ پہن کر باہر نکلتے اور سمنا کی طرف چل پڑتے۔ سڑکوں پر اُس وقت ہر طرف سے گروہ کے گروہ سمنا کی طرف جا رہے ہوتے تھے۔ پولس والوں کو اور گوروں کو یہ پتا ہی نہ چلتا کہ کون سے قانونی ہیں اور کون سے غیر قانونی۔ اتوار کے دن سب کو علم ہوتا تھا کہ آج ہمارے لوگوں کا فلم شو ہے اور بڑا مجمع ہو گا۔ مجمعے پر یہ لوگ ہاتھ نہیں ڈالتے۔ یہ بڑی مکار قوم ہے۔ اندر اندر سے اپنا کام کرتے ہیں اور مطلب نکال لیتے ہیں۔ اتوار کے دن ہم سب ایک ہوتے تھے، کیا قانونی اور کیا غیر قانونی۔ مگر آپس میں ہم ایک دوسرے کو دیکھ کر پہچان جاتے تھے۔ غیر قانونیوں کی چال ڈھال ہی مختلف ہوتی ہے۔ آج بھی میں کسی دو چار کے گروہ کو فٹ پاتھ پر چلتے ہوئے دیکھ لیتا ہوں تو مجھے پتا چل جاتا ہے۔ یہ لوگ ایک دوسرے کے ساتھ لگ کر چلتے ہیں اور اس کوشش میں رہتے ہیں کہ ایک دوسرے سے باتوں میں لگے رہیں۔ اور ایک خاص طریقے سے سر نیچے ڈال کر ادھر اُدھر دیکھتے ہیں جیسے کسی چیز کی آڑ سے دیکھ رہے ہوں، مگر آنکھ نہیں ملاتے۔ آج بھی جب ہم اس حالت سے نکل آئے ہیں اور ہم نے جائیداد بنا لی ہے اور اچھی ملازمت اختیار کر لی ہے، ہمارے طور طریقے سے شاید وہ بات نہیں گئی۔ اپنے کسی باعزت آدمی سے ملتے ہیں تو دل میں یہی کھٹکا رہتا ہے کہ کہیں اس نے ہماری اصلی پہچان نہ کر لی ہو۔ غربت کے نشانوں کو مٹانا آسان کام نہیں۔ میں کہتا ہوں غربت خواہ جسم کی ہو خواہ جان کی ایک لعنت ہے اور جرم ہے اور کسی کے حق میں نہیں آنی چاہیے۔ پچھلے سال میں چھٹی پر واپس وطن گیا تو ساتھ ایک کار لیتا گیا۔ کار ساتھ لے جانے کی ہم کو چھوٹ ہے۔ اپنے بھائی بند بڑی عزت کے ساتھ پیش آئے۔ مگر میں نے دیکھا کہ شہروں میں اچھے اچھے سرکاری ملازم اور پڑھے لکھے لوگ ہمیں حقارت اور نفرت سے دیکھتے تھے۔ میں کہتا ہوں یہ لوگ اپنی پڑھائی کے باوجود کوئی علم نہیں رکھتے۔ ان کو اس بات کا پتا نہیں کہ یہ غربت اور امارت کا معاملہ نہیں بلکہ عزت کا معاملہ ہے۔ جب لوگ اپنے گھر بار کو چھوڑ کر نکل جاتے ہیں

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

نوٹے ملک میں ان کے پاس صرف ایک چیز کی کمی رہ جاتی ہے۔ محنت ان کے ہاتھ میں ہوتی ہے اور دولت آتی جاتی رہتی ہے۔ مگر جس چیز کا وجود نہیں ہوتا وہ عزت ہوتی ہے۔ اپنے شہر میں دو وقت کی روٹی ملے یا نہ ملے، عزت جد پہ قائم ہوتی ہے۔ بے وطنی میں کوئی پہچان نہیں ہوتی، صرف اپنی جان ہوتی ہے۔ جن لوگوں نے کبھی اپنا گھر نہیں چھوڑا انہیں اس بات کا علم نہیں، ان کے حق میں یہ نہیں آتا کہ ہمارے اُوپر ہلکی نظر ڈالیں۔ ہم نے یہاں ایک پودا لگایا ہے، اور ایک پوری آبادی کے لیے عزت کی صورت پیدا کی ہے۔ اس کام میں ایک عمر ضائع ہو گئی ہے۔ مگر جن دنوں کی میں بات کر رہا ہوں اُن دنوں میں صرف ایک فلم شو ہماری عزت اور آزادی کا مرکز ہوتا تھا۔ گوروں کے اس گڑھ میں ہمارے کئی سو آدمیوں کا مجمع کھلے بندوں سنما کے آگے چلتا پھرتا تھا۔ کسی کا کوئی لباس کسی کا کوئی۔ کوٹ پتلون، پاجامہ، شلوار کُرتا، کوئی روک ٹوک نہیں، جو کسی کا دل چاہا پہن کر آگیا۔ لاؤڈ سپیکر پہ اُردو پنجابی کے گانے چل رہے ہوتے تھے جن کی آواز دور دور تک جاتی تھی۔ کوئی ڈر فکر نہیں، سب ایک دوسرے سے ہنستے بولتے تھے، قہقہے لگاتے تھے، پیچھے کی خبریں چلتی تھیں، کون آرہا ہے، کون جا رہا ہے، کون پکڑا گیا، کون جرمنی رُکا ہوا بیٹھا ہے، کس کا ایجنٹ اس کی جان ماری کر رہا ہے، کرنسی کی بلیک میں کون سب سے زیادہ پیسے دیتا ہے، کون سی فیکٹری میں نوکریاں نکل رہی ہیں۔ تبادلۂ خیال کا موقعہ ہوتا تھا۔ کچھ گورے ادھر سے گزرتے ہوئے ٹھہر جاتے تھے اور ہمارے ہجوم کو دیکھنے لگتے تھے۔ پولس کے ایک دو سپاہی بندوبست کے لیے موجود ہوتے تھے، مگر ایک طرف ہو کر خاموشی سے کھڑے رہتے تھے۔ کبھی کوئی مشہور فلم آتی تو ٹکٹوں کے لیے مار دھاڑ شروع ہو جاتی۔ پھر سپاہی آگے آجاتے تھے۔ مگر ڈنڈا چلانا ادھر کے سپاہیوں کا کام نہیں، بس ہاتھ ہلا کر اور منہ سے بول کر بندوبست کر دیتے ہیں۔ ہال کے اندر اور ہی سماں ہوتا تھا۔ مشہور گانوں کے ریکارڈ چلتے تھے۔ لتا منگیشکر۔ محمد رفیع۔ نور جہاں۔ فلم شروع ہوتی تو دنیا ہی بدل جاتی۔ اپنے ایکٹر اور ایکٹرسیں۔ اپنی بات چیت۔ اپنا ناچ گانا۔ اپنے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ہنسی مذاق۔ اپنی سٹوری۔ اپنے گھر بار کے منظر۔ ایسا لگتا تھا کہ اپنے وطن میں بیٹھے ہوئے ہیں۔ فلم بھی کیا عجیب چیز ہوتی ہے۔ کئی دفعہ ایسا ہوا کہ میں سٹوری میں بالکل گم ہو گیا۔ جب ہال میں روشنی ہوتی ہے تو پھر خیال آیا کہ میں کس جگہ پر بیٹھا ہوا ہوں، مگر خیال کو برابر ہونے میں کئی سیکنڈ لگ گئے۔ عجیب کیفیت ہوتی تھی۔ دردناک فلم ہوتی تو کئی لوگ رونے لگ جاتے۔ ہال میں جب ناکوں کی شوں شوں کی آواز آتی تو پتا چل جاتا کہ رو رہے ہیں۔ مگر میں کبھی نہیں رویا۔ میں فلم میں خواہ کتنا ہی گم ہو جاؤں مجھے یہ خیال رہتا ہے کہ یہ ایک سٹوری ہی ہے۔ مگر ایک بات میں نے یہاں آکر دیکھی ہے۔ بے وطنی کے اندر دل بہت نرم ہو جاتا ہے۔ اپنا گھر بار اور اپنے بیوی بچے جن کو پہلے کبھی آدمی ایسے دل پر نہیں لگاتا تھا اب اس طرح موقع بے موقع یاد آتے ہیں کہ دل ٹکڑے ٹکڑے ہونے لگتا ہے۔ یہاں پر عورتیں بھی مل جاتی ہیں اور بچے بھی، مگر وہ بات نہیں بنتی۔ اپنی زبان کا لطف، اپنی بات چیت، اپنا لباس، اپنی اُٹھ بیٹھ، لمبی لمبی دھوپ، اپنی آوازیں، اپنے ہاتھوں کی نرمی، یہ چیزیں نہیں ملتیں۔ بڑے بڑے شہر زور میں نے دیکھے ہیں، ہر چیز اُن کو حاصل ہوتی ہے، ہاتھ میں ہنر اور جیب میں پیسا ہوتا ہے، مگر بیٹھے بیٹھے رونے لگتے ہیں، جیسے کوئی مرض لاگو ہو۔ جب فلم شو ختم ہوتا اور ہال میں روشنی ہو جاتی تو لوگوں کے چہروں پر ایک رونق ہوتی۔ سینما سے باہر نکلتے نکلتے رونق آدھی رہ جاتی۔ رستے میں ہم فلم سٹوری کی باتیں کرتے اور اس کے مذاق آپس میں دہراتے ہوئے واپس آتے۔ اس طرح ہمارے ہفتے کا ایک بڑا موقع گزر جاتا۔

گھر واپس آکر ایک بار پھر گھریلو زندگی شروع ہو جاتی۔ آٹھ سے لے کر نو بجے تک رنڈی کا ٹائم مقرر تھا۔ بہت سی ہماری گلی میں ہی رہتی تھیں، اور اتوار کے لیے ہم نے اُن کے ساتھ ریٹ اور ٹائم طے کیا ہوا تھا۔ میرے آنے سے پہلے سُنا تھا کہ ہر کوئی اکیلا اکیلا پیسے خرچ کرتا تھا۔ پھر سب نے مل کر صلاح کی کہ اس طرح پیسے ضایع کرنے سے کچھ حاصل نہیں۔ حسین شاہ اس تجویز کو پیش کرنے والا تھا۔ بہودی اس کا بڑا لحاظ کرتا تھا، اسی لیے حسین شاہ اکیلا کمرے میں رہتا تھا

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

اور سنگل کرایہ دیتا تھا۔ حسین شاہ کی صلاح سب کی عقل میں آگئی۔ اُس دن کے بعد ایک سسٹم بن گیا۔ سسٹم یہ تھا کہ سب لوگ پیسے ایک جگہ اکٹھے ڈالیں جن کی ادائیگی یکمشت کر دی جائے۔ پھر باری باری سب فارغ ہو لیں۔ کوئی نیا گھر میں آتا تو اس کو سسٹم سے مطلع کر دیا جاتا اور باقی اس پر چھوڑ دیا جاتا۔ اگر وہ چاہتا تو سب کے ساتھ شریک ہو جاتا، نہ چاہتا تو الگ رہتا۔ آج تک ثاقب کے علاوہ کسی نے انکار نہیں کیا تھا۔ ثاقب کے انکار کرنے پر دل میں سب خوش تھے، کیونکہ وہ نوعمر لڑکا تھا اور ہم سب اُس کو بچوں کی مانند جانتے تھے۔ حسین شاہ سسٹم کو چلانے کا ذمہ دار تھا۔ تین رنڈیوں کے ساتھ ہمارا کاروبار تھا جو باری باری ایک ایک اتوار کو آتی تھیں۔ چوتھی اتوار کو پھر پہلی کی باری آجاتی تھی۔ اگر مصروفیت کی وجہ سے ایک ہی رنڈی اکٹھی دو اتواروں کو چلی آتی تو اس کو کم ریٹ دیا جاتا تھا۔ یہ معاہدہ طے تھا اور حسین شاہ اس پر سختی سے عمل کرواتا تھا۔ رنڈیوں نے جگہ جگہ پر اس قسم کے ٹھیکے کر رکھے تھے۔ ٹھیک آٹھ بجے رنڈی بن سنور کر آپہنچتی۔ گھر والے پہلے ہی اندر بیٹھے انتظار کر رہے ہوتے۔ گھر میں داخل ہو کر وہ پکارتی، "کم آن بوائز۔ فیڈنگ ٹائم"۔ اور دوسری منزل پر چڑھ جاتی۔ دوسری منزل پر حافظ آبادیوں کا ایک کمرہ اس مقصد کے لیے استعمال ہوتا تھا۔ سب آدمی کمرے کے باہر جمع ہو جاتے اور آہستہ آہستہ باتیں کرنے لگتے۔ مگر جوں جوں کارروائی آگے چلتی ہنسی مذاق بڑھتا جاتا اور آوازیں اونچی ہونے لگتیں۔ سب سے پہلے حسین شاہ فارغ ہوتا۔ یہ بات شروع سے تسلیم شدہ تھی کہ حسین شاہ کا پہلا نمبر ہے۔ اس کے علاوہ وہ نمازی بھی تھا۔ حسین شاہ کے بعد دوسرے نمازیوں کا نمبر آتا جو کل چار تھے، تین میرپوری اور چوتھا شیر باز حافظ آبادی۔ نمازی اپنے غسل کے بے حد پابند تھے اور انہوں نے اپنے اپنے شلنگ پانی گرم کرنے کے میٹر میں پہلے ہی ڈال دیے ہوتے تھے۔ اس کے علاوہ گھر میں ان کی عزت تھی۔ جب نمازی فارغ ہو جاتے اور غسل کے لیے نیچے چلے جاتے تو پھر باقیوں کی باری آتی۔ جیسے جیسے کوئی کمرے سے باہر نکل کر آتا اس

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

کے ساتھ گندے مذاق کیے جاتے۔ دروازے کے باہر اُوپر اور نیچے کی سیڑھیوں تک قطار لگی ہوتی۔ جو کوئی اندر سے نکلتا اُس کو پوری قطار کا ٹھٹھا برداشت کرنا پڑتا۔ اس کے باوجود ہر کسی کی یہ کوشش ہوتی کہ پہلے اُس کا نمبر آئے، چنانچہ دھکم پیل جاری رہتی۔ مگر اس کا بھی سسٹم طے شدہ تھا۔ حافظ آبادیوں کا کمرہ استعمال ہوتا تھا اس لیے ان کا حق پہلے نکلتا تھا۔ ان کے بعد سنارٹی کا حساب ہوتا تھا۔ گھر میں جتنا پرانا کوئی رہنے والا تھا اتنا ہی اُونچا قطار میں اُس کا نمبر آتا تھا۔ سب سے آخر میں بنگالیوں کی باری آتی تھی۔ بنگالی حالانکہ گھر میں کافی پرانے رہنے والے تھے اور اس حساب سے ان کی جگہ قطار کے درمیان میں ہونی چاہیے تھی۔ مگر اُن کو دھکا زوری سے قطار کے آخر میں بھیج دیا جاتا تھا۔ رنڈیوں کو بھی علم تھا کہ بنگالیوں کی حیثیت سب سے چھوٹی ہے۔ چنانچہ اُن کے داخل ہوتے ہی رنڈی شور مچانا شروع کر دیتی۔ اندر سے، "جانور ــــ جانور" کی آوازیں آتیں اور رنڈی جلدی ہی بنگالیوں کو فارغ کر کے باہر نکال دیتی۔ پھر وہ غصے میں باہر آتی اور کہتی، "حسین شاہ کہاں ہے؟" حسین شاہ اگر غسلخانے میں ہوتا تو وہ نیچے جا کر باتھ روم کا دروازہ پیٹتی اور کہتی، "آج کے بعد میں ان جانوروں کی شکل دیکھنے کے لیے تیار نہیں۔ یہ دس دس پونڈ پر بھی مہنگے ہیں۔ سُن لیا؟" بنگالی شرمسار ہو کر اپنے حق میں کچھ بولنے کی کوشش کرتے اور پھر اپنے کمرے میں چلے جاتے۔ یہ ڈرامہ ہر اتوار کو ہوتا تھا اور ہمارے شغل کا ایک حصہ بن چکا تھا۔ ہم لوگ بنگالیوں سے دھول دھپا کرتے رہتے تھے، مگر اندر ہی اندر اس معاملے پر ان سے جلتے بھی تھے کہ نہ جانے ان کے پاس کون سا ایسا ہتھیار ہے جو ہمارے پاس نہیں، اور ہنسی مذاق میں ان سے دریافت کرنے کی کوشش کرتے رہتے تھے۔ آخر میں بنگالیوں نے ہم سے اپنا بدلہ لے لیا اور بڑا سخت لیا۔ مگر جب تک آرام سے کام چلتا رہا سب لوگ بنگالیوں سے فائدہ اُٹھاتے رہے۔

اتوار کا دن آدھی رات تک چلتا رہتا۔ نو بجے کے بعد غسل کے لیے قطار لگ جاتی۔ ایک ڈیڑھ گھنٹہ اسی میں گزر جاتا۔ نمازی پہلے غسل سے فارغ ہو کر نماز ادا

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

کرتے۔ اتوار کا دن چونکہ عبادت کا ہوتا وہ دل لگا کر عبادت کرتے۔ ان کے کمروں سے دیر تک دعا اور استغفار پڑھنے کی آوازیں آتی رہتیں۔ باقی لوگ غسل سے فارغ ہو کر ٹولیوں میں بٹ جاتے اور ایک دو کمروں میں بیٹھ کر تاش کی بازی لگا لیتے۔ اس وقت ہم میں سے کئی ایک کے ایجنٹ اپنا ہفتہ وار قرض وصول کرنے کے لیے آ پہنچتے۔ کبھی کبھی تو تُو تُو مَیں مَیں ہوتی، مگر یہ لوگ اپنے پیسے چھوڑ کر نہ جاتے۔ اُن کے جانے کے بعد تاش کی بازی جاری رہتی۔ ساتھ ساتھ ہلکی ہلکی گفت و شنید بھی ہوتی رہتی۔ خبر اخبار، پیچھے کی باتیں، زمینوں کی قیمت، فصلوں کا حال، مہنگائی کا ذکر۔ جیسے جیسے کوئی نیند اور تھکاوٹ سے مغلوب ہوتا جاتا اُٹھ کر سونے چلا جاتا۔ وہ عجیب اُداسی کا وقت ہوتا۔ مکان پر خاموشی چھا جاتی اور ہماری آوازیں آہستہ آہستہ کمزور پڑنے لگتیں، جیسے کوئی چیز اندر سے نکل گئی ہو۔ اس طرح اتوار کا دن اپنے خاتمے کو پہنچتا۔ پھر اگلی اتوار کے انتظار میں سات دن کی روٹین شروع ہو جاتی۔ وقت کا پتا بھی نہ چلتا۔

جب تک وقت آرام سے نکلتا گیا یہ سلسلہ اسی طرح چلتا رہا۔ مگر سال سوا سال کے بعد ہمارے گھر میں ایک ایسی تبدیلی آئی کہ سارا نقشہ ہی بدل گیا۔ ایک دن میں کام سے واپس آیا تو گھر میں داخل ہوتے ہی میں نے محسوس کر لیا کہ کوئی بات ہے۔ اُوپر گیا تو حسین شاہ کے کمرے سے ایک عورت کے بولنے کی آواز آئی۔ ثاقب اپنے اٹک سے اُتر کر میرے کمرے میں آیا اور بولا کہ حسین شاہ ایک گوری عورت کو اپنے ساتھ لے آیا ہے۔ ہم دونوں خاموشی سے بیٹھ گئے اور حسین شاہ کے کمرے کی دیوار سے کان لگا کر سُننے لگے۔ تھوڑی دیر کے بعد غلام محمد بھی آ پہنچا۔ غلام محمد نے کمرے کی بتی جلائی تو میں نے اور ثاقب نے ہونٹوں پر اُنگلی رکھ کر اُس کو شور نہ کرنے اور اشارے سے بتی بجھانے کو کہا۔ غلام محمد کی زندگی سیٹ ہو چکی تھی۔ آج اس تبدیلی کو دیکھ کر اُس کی حرکت میں فرق آ گیا۔ وہ بے سمجھی سے کمرے میں اِدھر اُدھر دیکھنے لگا۔ پھر ہمارے اشاروں کو دیکھ کر اُس نے بتی بجھا دی اور ہمارے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

پاس آکر بیٹھ گیا۔ ہم نے سرگوشیوں میں اُسے مطلع کیا کہ حسین شاہ ایک گوری عورت کو لے آیا ہے جو اس وقت اُس کے کمرے میں ہے۔ غلام محمد کی آنکھیں پھٹ گئیں۔ اُس نے پوچھا، "رنڈی ہے؟" اور کان دیوار کے ساتھ لگا دیا۔ ہم تینوں دیر تک بیٹھے آوازیں سُنتے رہے۔ حسین شاہ ان پڑھ تھا، مگر انگریزی میں اپنا کام خوب چلا لیتا تھا۔ زیادہ تر آوازیں حسین شاہ کی باتوں کی آ رہی تھیں۔ مگر بیچ بیچ میں عورت بھی ایک دو لفظ بول دیتی تھی۔ جب عورت کی پتلی سی آواز آتی تو ہمارے کانوں کا سارا زور اس طرف لگ جاتا۔ ہمیں کسی بات کی سمجھ نہ آ رہی تھی، مگر جب وہ بولتی تو ہمارے دل دھک دھک کرنے لگتے۔ غلام محمد اپنے سیٹ کام کا جو بھول چکا تھا۔ کھانے دانے کا بندوبست کرنا بھی کسی کو یاد نہ رہا تھا۔ کیونکہ کھانے پکانے سے بتی کی روشنی اور برتنوں کی کھڑک ہونے کا اندیشہ تھا، اور ہماری حالت ایسی تھی کہ جیسے ہمارے ہاتھ پیر جُڑ گئے ہوں، اور ذرا سی حرکت ہوئی تو آوازیں آنی بند ہو جائیں گی اور عورت وہاں سے اُٹھ کر بھاگ جائے گی۔ غلام محمد بار بار پوچھ رہا تھا، "رنڈی ہے؟"

ہم میں سے کسی کو معلوم نہ تھا۔ ہم کبھی ہاں میں اور کبھی نہ میں سر ہلا کر جواب دیتے۔ تھوڑی دیر کے بعد غلام محمد نے پوچھا: "یہ یہاں رہے گی؟"

ہمیں محسوس ہوا کہ جیسے یہ سوال پہلے ہی ہمارے دل میں تھا۔ ہمارا دل کہتا تھا کہ یہ رات کو یہاں رہے گی، مگر ہمیں یقین نہ آتا تھا۔ اس گھر کے اندر کسی عورت نے رات بسر نہ کی تھی۔ ہم نے کئی گوری عورتوں کو اپنے آدمیوں کے ساتھ گھومتے پھرتے ہوئے دیکھا تھا، مگر ہمیں علم تھا کہ وہ رنڈیاں تھیں۔ ہمارے فہم میں نہیں آتا تھا کہ کوئی ایک یہاں آکر رہنا شروع کر دے گی۔ جیسے جیسے وقت گزرتا گیا یہ خیال ہوکے کی طرح ہمارے دل کے اُوپر بیٹھتا گیا۔ ہمارے سانس بالکل رُک گئے اور جان کانوں میں آ گئی۔ باتوں کی آواز اُسی طرح ٹھہر ٹھہر کر آ رہی تھی۔ ہمیں اس سے غرض نہیں تھی کہ کیا باتیں ہو رہی ہیں یا دیوار

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

کے اُس طرف کیا کچھ جاری ہے۔ ہمارے سامنے صرف ایک سوال تھا کہ کیا یہ عورت یہاں رہے گی؟ اس ایک بات پر ہمارے گھر کے نظم و ضبط کا انحصار تھا۔ سُننے میں یہ بات بے وقوفی کی لگتی ہے۔ مگر اُس وقت شاید قدرت کی طرف سے ہمارے دل میں آنے والے واقعات کا ہلکا سا علم ڈالا جا رہا تھا۔ ہم دو ڈھائی گھنٹے تک اُسی طرح اندھیرے میں دیوار کے ساتھ جُڑ کر بیٹھے رہے۔ حسین شاہ کے کام پر جانے کا وقت دیر ہوئی نکل چکا تھا۔ بھوک کی وجہ سے ہمارے پیٹ گڑگڑ کرنے لگے تھے، مگر کوئی اپنی جگہ سے نہ ہلا۔ یکایک باتوں کی آواز بند ہو گئی۔ جب کئی منٹ تک آواز نہ آئی تو ثاقب اٹھ کر دبے پیر دروازے تک گیا۔ واپس آکر اُس نے ہمیں بتایا کہ حسین شاہ کے دروازے کے نیچے روشنی بند ہو چکی ہے۔ ہم دنگ رہ گئے۔ حسین شاہ اور وہ عورت بتی بجھا کر سو چکے تھے۔ حسین شاہ نے ہماری ہوش میں ایک دن بھی کبھی کام سے ناغہ نہیں کیا تھا۔ آہستہ آہستہ ہمارے ہاتھ پیر کھلنے لگے۔ ہم تینوں اپنی جگہ سے اُٹھ کھڑے ہوئے۔ پھر غلام محمد نے جا کر بتی جلائی۔ میں آہستہ آہستہ قدم رکھتا ہوا باہر نکلا اور کھانا پکانے کا بندوبست کرنے لگا۔ مگر ہماری آنکھیں اور ہمارے کان حسین شاہ کے دروازے پر لگے تھے، جیسے کہ اس دروازے کے پیچھے جو واقعہ ہوا تھا اُس سے ہماری دنیا بدل گئی ہو۔ نیچے کی منزلوں پر بھی یہی حالت تھی۔ ابھی تک کوئی سویا نہ تھا۔ دبے دبے پیر سب چل پھر رہے تھے۔ کئی بار ایسا ہوا کہ نیچے رہنے والا کوئی ہماری سیڑھیوں تک آیا اور ایک دو منٹ کھڑا رہنے کے بعد واپس ہو گیا۔ کانا پھوسی کی آواز ہر طرف سے آ رہی تھی۔ مکان پر خاموشی چھائی ہوئی تھی، مگر مکھیوں کے چھتے کی طرح اس کے اندر بے حساب حرکت تھی اور اس کی گونج بھری ہوئی تھی۔ جب ہم کھانے کے لیے اپنے گدوں پر بیٹھے تو ہمیں پتا چلا کہ ثاقب کو آج کھانا نہیں ملا۔ اُس نے ہمیں بتایا کہ حسین شاہ نے کھانا پکایا تھا، مگر اٹھا کر اپنے کمرے میں لے گیا تھا۔ ثاقب اپنے اٹک میں ہی بیٹھا رہا۔ ہم نے اپنی روٹی